ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1958

Program: BS Islamic Studies (Spec. Qur'an & Tafsir)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس :قرآن اور مستشرقین • (1958) سطح :بی ایس علوم اسلامیہ) تخصص قرآن و تفسیر(

سمسٹر :خزاں2026

امتحانی مشق نمبر) 1 یونٹ 1 تا(5

کل نمبر • 100 :کامیابی کے نمبر50 :

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

)مطالعہ و حوالہ کے لیے(

نوٹ :یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ کسی دوسرے طالب علم کی تحریر یا اس گائیڈ کی ہو بہو نقل کرنا تعلیمی بددیانتی ہے اور یونیورسٹی کی پالیسی کے مطابق کارروائی ہو سکتی ہے۔

سوال نمبر :1 مستشرقین کے تحقیقی اور علمی اہداف 20) نمبر(

سوال نمبر1 ۔ مستشرقین کے تحقیقی اور علمی اہداف پر نوٹ قلم بند کیجئے۔(20)

تعارف

استشراق سے مراد مغربی اہلِ علم کی وہ منظم علمی کوشش ہے جس کے تحت انہوں نے مشرق، خصوصاً عالمِ اسلام، کی زبانوں، مذاہب، تاریخ، تہذیب اور ادب کا مطالعہ کیا۔ مستشرق اس مغربی عالم کو کہتے ہیں جو عربی، فارسی، ترکی یا اردو جیسی مشرقی زبان سیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے علمی ورثے کو اپنے مطالعے کا موضوع بنائے۔ یہ مطالعہ صدیوں پر محیط ہے اور اس کے پیچھے کئی طرح کے اہداف کارفرما رہے ہیں۔ اس سوال میں بنیادی طور پر ان تحقیقی اور علمی

اہداف کا جائزہ مقصود ہے جو مستشرقین نے بظاہر اپنے پیشِ نظر رکھے، یعنی زبان و ادب کی تحقیق، مخطوطات کی بازیافت و اشاعت، تاریخ و تہذیب کا مطالعہ اور مغربی جامعات میں مشرقی علوم کی تدریس و ترویج۔

یہ بات ابتداء ہی میں واضح رہنی چاہیے کہ مستشرقین ایک یکسان گروہ نہیں ہیں۔ ان میں خالص علمی ذوق رکھنے والے محقق بھی ہیں، مذہبی مناظرے کے جذبے سے سرشار اہلِ قلم بھی، اور نوآبادیاتی اداروں سے وابستہ ماہرین بھی۔ اسی لیے ان کے علمی اہداف کا مطالعہ کرتے وقت تعمیم سے بچنا اور ہر بڑے مستشرق کے کام کو اس کے اپنے سیاق میں دیکھنا ضروری ہے۔ ذیل میں ان اہداف کو ترتیب وار بیان کیا جاتا ہے۔

استشراق کا تاریخی پس منظر اور علمی اہداف کی تشکیل

مغرب میں اسلامی علوم کے مطالعے کا باقاعدہ آغاز قرونِ وسطیٰ میں ہوا، جب اندلس اور سسلی کے راستے عربی علم یورپ پہنچا۔ بارہویں صدی عیسوی میں قرآن مجید کا پہلا لاطینی ترجمہ تیار ہوا اور عربی کتب کے تراجم کا سلسلہ شروع ہوا۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں یورپی جامعات میں عربی کے استادی مناصب قائم ہوئے، مطابع میں عربی حروف کی طباعت شروع ہوئی اور لائڈن، آکسفورڈ اور پیرس جیسے مراکز میں مشرقی مخطوطات جمع ہونے لگے۔ انیسویں صدی میں یہ کام اپنے عروج پر پہنچا، جب بڑے پیمانے پر مخطوطات کی فہرستیں، لغات، قواعد کی کتب اور تنقیدی متون شائع ہوئے۔

اس طویل سفر میں علمی اہداف بھی ارتقا پذیر رہے۔ ابتدائی دور میں ہدف زیادہ تر مذہبی مناظرہ اور اسلام سے آگاہی برائے رد تھا۔ بعد ازاں لسانیات، تقابلی مذاہب اور تاریخ کی جدید سائنٹیفک روش نے مطالعے کو نئی جہتیں دیں۔ بیسویں صدی میں علاقائی مطالعات کے نام سے یہ تحقیق جامعات اور تحقیقی اداروں کا مستقل شعبہ بن گئی۔ اس تاریخی تناظر کو سامنے رکھے بغیر مستشرقین کے اہداف کو سمجھنا مشکل ہے، کیونکہ ہر دور کے اہداف اس دور کے علمی رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔

زبان، ادب اور لسانیات کی تحقیق

مستشرقین کا پہلا نمایاں تحقیقی ہدف مشرقی زبانوں کی تدوین و تحقیق تھا۔ انہوں نے عربی زبان کی صرف و نحو پر ضخیم کتب لکھیں، بڑی لغات مرتب کیں اور عربی ادب کی تاریخ کو موضوع بنایا۔ رائن ہارٹ ڈوزی، ولیم رائٹ اور کارل بروکلمان جیسے محققین کی کتب آج بھی حوالے کا درجہ رکھتی ہیں۔ بروکلمان کی عربی ادب کی تاریخ اس ہدف کی سب سے بڑی مثال ہے، جس میں ہزاروں مصنفین اور ان کی تصانیف کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح فارسی، ترکی اور اردو ادب پر بھی مستند کتب لکھی گئیں اور مشرقی شاعری و نثر کے تراجم مغربی زبانوں میں منتقل ہوئے۔

لسانی تحقیق میں ان کا ایک ہدف سامی زبانوں کا تقابلی مطالعہ بھی تھا۔ عربی، عبرانی، آرامی اور حبشی زبانوں کے باہمی تعلق کی تحقیق سے انہوں نے قرآنی الفاظ کی اصل اور ان کے ارتقا پر بحثیں چھیڑیں۔ آرتھر جیفری نے قرآن کے غیر ملکی الفاظ پر کتاب لکھی اور تھیوڈور نولڈکے نے سامی لسانیات پر اہم کام کیا۔ یہ لسانی کام اپنی جگہ علمی قدر رکھتا ہے، اگرچہ اس کے بعض نتائج، خصوصاً قرآنی الفاظ کو بیرونی مآخذ سے جوڑنے کی کوشش، مسلم علماء کی تنقید کا نشانہ بنے ہیں۔

مخطوطات کی بازیافت، فہرست سازی اور تنقیدی اشاعت

دوسرا بڑا علمی ہدف اسلامی مخطوطات کو جمع کرنا، ان کی فہرستیں بنانا اور انہیں تنقیدی انداز میں شائع کرنا تھا۔ یورپ کی بڑی کتب خانوں میں ہزاروں عربی مخطوطات پہنچے اور مستشرقین نے ان کی مبسوط فہرستیں مرتب کیں، جن سے دنیا بھر کے محققین کو ان خزانوں تک رسائی ملی۔ بڑے محققین کی نگرانی میں تاریخ، تفسیر، حدیث اور سیرت کی بنیادی کتب پہلی مرتبہ چھپ کر سامنے آئیں۔ مثال کے طور پر طبری کی تاریخ اور تفسیر، ابن سعد کی طبقات اور ابن ہشام کی سیرت کی اشاعت میں مغربی اداروں اور محققین کا نمایاں حصہ رہا ہے۔

اس ہدف کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ بہت سے نایاب مخطوطات ضائع ہونے سے بچ گئے اور ان کے متون محققین کے سامنے آ گئے۔ مسلم علماء نے بھی اس خدمت کا اعتراف کیا ہے۔ تاہم تنقیدی نکتہ نظر سے یہ بھی دیکھا گیا کہ مخطوطے کے انتخاب، متن کی ترجیح اور حواشی میں محقق کا اپنا زاویۂ نگاہ اثر انداز ہوتا تھا، اور بعض اوقات ضعیف یا

غیر معروف نسخے کو بنیاد بنا کر ایسے نتائج نکالے گئے جو مجموعی روایت سے میل نہیں کھاتے تھے۔ اس لیے مخطوطات کی اشاعت کی خدمت کو سراہنے کے ساتھ ساتھ ان کے حواشی و مقدمات کو تنقیدی نظر سے پڑھنا بھی ضروری قرار پایا۔

قرآن، حدیث، سیرت اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ

تیسرا اور اس کورس سے سب سے زیادہ متعلق ہدف، قرآن مجید، حدیث، سیرت اور اسلامی تاریخ کا خصوصی مطالعہ تھا۔ نولڈکے نے تاریخِ قرآن لکھی، گولڈزیہر نے حدیث و سیر پر تنقیدی کتب تصنیف کیں، جوزف شاخت نے فقہ و حدیث کی تاریخ کو موضوع بنایا، ولیم میور نے سیرت و تاریخِ اسلام پر لکھا، اور رچرڈ بیل اور مونٹگمری واٹ نے قرآن و سیرت کے نئے مطالعے پیش کیے۔ ان کتب نے مغرب میں اسلام کے بارے میں معلومات کی بنیاد رکھی اور مغربی قاری کے ذہن میں اسلام کی تصویر بڑی حد تک انہی تحریروں سے بنی۔

ان مطالعات کا ظاہری علمی ہدف یہ بتایا گیا کہ اسلام کی تاریخ کو جدید تاریخی تنقید کے اصولوں پر پرکھا جائے، مآخذ کی سندی حیثیت جانچی جائے اور واقعات کو زمانی ترتیب سے مرتب کیا جائے۔ اپنی اس کوشش میں مستشرقین نے واقعی بعض مفید کام کیے، مثلاً سیرت کی زمانی ترتیب، اسناد کے تقابلی جائزے اور مخطوطات کی تاریخ بندی۔ لیکن مسلم محققین کی رائے میں ان مطالعات کا بنیادی مسئلہ یہ رہا کہ ان کا نقطۂ آغاز ہی یہ مفروضہ تھا کہ قرآن و سنت کو عام انسانی کتابوں کی طرح تاریخی تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا، اور جہاں روایت ان کے مقرر کردہ معیار سے مختلف ہوئی وہاں اسے رد کر دیا گیا۔ یوں ظاہری علمی ہدف کے اندر ایک مخصوص فکری رویہ پوشیدہ رہا جس کا جائزہ اس کورس کے اگلے مباحث میں تفصیل سے آتا ہے۔

مشرقی معاشروں کا مطالعہ اور ادارہ جاتی ترویج

چوتھا ہدف مشرقی معاشروں کی سماجی، معاشی اور تہذیبی زندگی کو سمجھنا تھا۔ مستشرقین نے مسلمانوں کے عقائد، رسوم، قوانین، صوفی تحریکوں، فرقوں اور روزمرہ زندگی پر کتب لکھیں، سفرنامے مرتب کیے اور لوک ادب جمع کیا۔ سنوک ہرخرونیے اور ایڈورڈ لین جیسے محققین کی کتب اسی قبیل سے ہیں۔ تقابلی مذاہب کے مطالعے میں اسلام کو

یہودیت و عیسائیت کے ساتھ رکھ کر پرکھا گیا اور اس تقابل سے اکثر یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش ہوئی کہ اسلام نے اپنے عقائد پچھلے مذاہب سے اخذ کیے ہیں۔

پانچواں ہدف اس علم کی ادارہ جاتی ترویج تھا۔ مغربی جامعات میں مشرقی زبانوں کے شعبے قائم ہوئے، علمی مجلات جاری ہوئے، کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جیسا ضخیم منصوبہ مکمل ہوا، جس کے مقالات آج بھی حوالے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس ادارہ جاتی ڈھانچے نے استشراق کو ایک مستقل علم کی حیثیت دی اور اس کی تحریروں کو عالمی علمی دنیا میں سند کا درجہ حاصل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین کے علمی اہداف کا اثر صرف کتابوں تک محدود نہ رہا بلکہ تعلیمی نصابوں، ذرائع ابلاغ اور عام مغربی رائے پر بھی مرتب ہوا۔ خلاصہ یہ کہ ان کے تحقیقی و علمی اہداف میں زبان و ادب، مخطوطات، قرآن و سنت کا مطالعہ، معاشرتی تحقیق اور ادارہ سازی، سب شامل تھے اور ان میں سے ہر ہدف کے مثبت اور قابلِ تنقید دونوں پہلو موجود ہیں۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ مستشرقین کے تحقیقی اور علمی اہداف کثیر الجہت تھے :عربی و مشرقی زبانوں اور ان کے ادب کی تحقیق، نایاب مخطوطات کی بازیافت و اشاعت، قرآن، حدیث، سیرت اور اسلامی تاریخ کا جدید اسلوب میں مطالعہ، مشرقی معاشروں کی تہذیبی تحقیق اور جامعات و علمی اداروں کے ذریعے اس علم کی ترویج۔ ان اہداف کے تحت ہونے والے کام کا ایک حصہ حقیقی علمی خدمت ہے جس سے مسلم محققین نے بھی استفادہ کیا ہے، جبکہ دوسرا حصہ مخصوص مفروضات اور مخصوص زاویۂ نگاہ کا حامل ہے۔ ایک طالب علم کے لیے درست روش یہی ہے کہ وہ مستشرقین کے کام کو نہ اندھا دھند قبول کرے اور نہ یکسر رد، بلکہ ہر دعوے کو اصل مآخذ اور مضبوط دلائل کی روشنی میں پرکھے۔ یہی متوازن رویہ اس کورس کا بنیادی سبق ہے۔

سوال نمبر :2 عہدِ نبوی ﷺ اور عہدِ عثمانی میں جمعِ قرآن کی نوعیت 20) نمبر(

سوال نمبر2 ۔ عہدِ نبوی ﷺ اور عہدِ عثمانیؓ میں جمعِ قرآن کریم کی نوعیت بارے نوٹ تحریر کیجئے۔(20)

تعارف

جمعِ قرآن سے مراد قرآن مجید کو اس شکل میں محفوظ کرنا ہے کہ اس کی تمام آیات و سورتیں ایک مرتب مجموعے کی صورت میں امت کے پاس موجود ہوں۔ یہ عمل تین بڑے مراحل میں مکمل ہوا :عہدِ نبوی میں وحی کی فوری کتابت اور حفظ، عہدِ صدیقی میں منتشر صحیفوں کو ایک مصحف میں جمع کرنا، اور عہدِ عثمانی میں اسی مصحف کے معیاری نسخے تیار کر کے عالمِ اسلام میں بھیجنا۔ اس سوال میں پہلے اور تیسرے مرحلے کی نوعیت کا جائزہ مقصود ہے، تاہم درمیانی مرحلے کا مختصر ذکر دونوں کو جوڑنے کے لیے ناگزیر ہے۔

نوعیت سے مراد یہ ہے کہ ہر دور میں جمع کا کام کس صورت میں ہوا، اس کے ذرائع کیا تھے، اس کا مقصد کیا تھا اور اس کی حدود کیا تھیں۔ یہ تفہیم اس لیے اہم ہے کہ مستشرقین کے بیشتر اعتراضات اسی نکتے سے پیدا ہوتے ہیں کہ وہ ہر دور کے کام کی نوعیت کو سمجھے بغیر اس پر وہ سوال اٹھا دیتے ہیں جو اس دور کے کام سے متعلق ہی نہیں ہوتا۔

عہدِ نبوی میں جمع کی نوعیت: حفظ و کتابت کا امتزاج

عہدِ نبوی میں جمعِ قرآن کی نوعیت دوہری تھی :سینوں میں حفظ اور موادِ کتابت پر تحریر۔ قرآن تدریجاً تقریباً تئیس برس میں نازل ہوا اور جیسے جیسے آیات نازل ہوتیں، نبی کریم ﷺ انہیں صحابہ کو یاد کراتے اور ساتھ ہی کاتبینِ وحی سے لکھوا بھی دیتے۔ کتابت کے لیے مخصوص صحابہ مقرر تھے جنہیں کاتبینِ وحی کہا جاتا ہے۔ ان میں زید بن ثابت، ابی بن کعب، معاویہ بن ابی سفیان اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ ﷺ کاتب کو بلا کر فرماتے کہ اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں آیات کے ساتھ رکھو، یوں آیات کی ترتیب خود آپ ﷺ کی ہدایت سے طے ہوتی تھی۔

کتابت کے ذرائع اس دور کے دستیاب مواد تھے :چمڑے کے ٹکڑے، کھجور کی چھال و شاخیں، پتھروں کی تختیاں، اونٹ کے شانے کی ہڈیاں اور رقعے۔ اس مواد کی نوعیت کی وجہ سے عہدِ نبوی میں پورا قرآن ایک جلد بند کتاب کی صورت میں موجود نہیں تھا، بلکہ لکھا ہوا قرآن مختلف صحابہ کے پاس منتشر صحیفوں کی صورت میں محفوظ تھا۔ اس کے ساتھ سینکڑوں صحابہ کے سینے مکمل قرآن کے حافظ تھے اور مسجدِ نبوی و صفہ کے حلقوں میں قرآن کی تعلیم و تلاوت کا مسلسل سلسلہ جاری تھا۔ ہر رمضان میں آپ ﷺ جبریل علیہ السلام کے سامنے نازل شدہ قرآن کا دور کرتے، جسے عرضہ

کہا جاتا ہے، اور آخری سال یہ دور دو مرتبہ ہوا، جسے عرضۂ اخیرہ کہتے ہیں، اور اس میں قرآن اپنی آخری ترتیب کے ساتھ مکمل ہوا۔

پس عہدِ نبوی میں جمع کی نوعیت یہ تھی کہ متن مکمل طور پر لکھا بھی جا چکا تھا اور حفظ بھی، آیات و سورتوں کی ترتیب بھی متعین تھی، لیکن یہ مواد یکجا جلد کی صورت میں مرتب نہیں تھا۔ اس دور کے کام کا مقصد وحی کی فوری حفاظت اور اس کی تعلیم و ابلاغ تھا، اور اس مقصد کے لحاظ سے یہ نظام اپنے وقت کے وسائل میں مکمل اور مضبوط تھا، کیونکہ متن کی حفاظت کسی ایک نسخے پر نہیں بلکہ ہزاروں حافظوں اور متعدد تحریری صحیفوں کے باہمی اتفاق پر قائم تھی۔

عہدِ صدیقی کا عبوری مرحلہ

عہدِ نبوی اور عہدِ عثمانی کے درمیان عہدِ صدیقی کا مرحلہ آتا ہے جس میں جنگِ یمامہ میں کثیر حفاظ کی شہادت کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں پورے قرآن کو ایک جگہ جمع کرنے کا حکم دیا۔ زید بن ثابت نے سخت احتیاط سے ہر آیت کو تحریری صحیفے اور گواہوں کی تصدیق کے ساتھ جمع کیا اور یوں پہلی مرتبہ قرآن ایک مرتب مجموعے یعنی مصحف کی صورت میں تیار ہوا۔ یہی مصحف بعد میں حضرت عمر اور پھر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہم کے پاس رہا اور عہدِ عثمانی کے کام کی بنیاد بنا۔ اس مختصر ذکر سے واضح ہوتا ہے کہ عثمانی جمع دراصل اسی صدیقی مصحف کی توسیع و معیار سازی تھا، کوئی نیا متن نہیں تھا۔

عہدِ عثمانی میں جمع کی نوعیت :توحیدِ مصحف و رسم

عہدِ عثمانی میں جمع کی نوعیت پہلے دور سے مختلف تھی۔ یہاں مقصد قرآن کو پہلی بار جمع کرنا نہیں تھا، بلکہ پہلے سے جمع شدہ قرآن کے ایک معیاری سرکاری متن کی تیاری اور اس کی اشاعت تھا۔ اس کی ضرورت اس وقت پیش آئی جب اسلام عراق، شام، آرمینیا اور آذربائیجان تک پھیل گیا اور مختلف علاقوں کے مسلمانوں میں قراءت کے اختلافات نمایاں

ہونے لگے۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے یہ منظر دیکھ کر مدینہ آ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو توجہ دلائی کہ امت کتاب کے بارے میں اختلاف میں مبتلا ہونے سے پہلے اس کا بندوبست کیا جائے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مشاورت کے بعد حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس موجود صدیقی مصحف منگوایا اور زید بن ثابت کی سربراہی میں عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص اور عبدالرحمن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم پر مشتمل کمیٹی بنائی۔ ہدایت یہ تھی کہ اختلاف کی صورت میں لہجۂ قریش میں لکھا جائے، کیونکہ قرآن اسی لہجے میں نازل ہوا تھا۔ کمیٹی نے مصحف کی نقلیں تیار کیں، اصل مصحف حضرت حفصہ کو واپس کر دیا گیا اور یہ معیاری نسخے، جنہیں مصاحفِ امہات کہا جاتا ہے، مکہ، شام، کوفہ، بصرہ اور دیگر بڑے شہروں کو ایک ایک قاری کے ساتھ بھیج دیے گئے۔ ساتھ ہی حکم دیا گیا کہ اس کے مخالف ذاتی صحیفے ضائع کر دیے جائیں تاکہ اختلاف کی جڑ ختم ہو جائے۔

اس دور کے مصحف کی چند خصوصیات اس کی نوعیت کو واضح کرتی ہیں۔ اول، اس کا رسم الخط یعنی املا وہی تھا جو صدیقی مصحف کا تھا، اسے رسمِ عثمانی کہا جاتا ہے۔ دوم، یہ مصحف اس وقت کے عربی رسم کے مطابق نقطوں اور اعراب سے خالی تھا، کیونکہ عرب قارئین لہجے اور سیاق سے درست پڑھ لیتے تھے؛ نقطے و اعراب کا اضافہ بعد میں اموی دور میں ہوا اور وہ متن میں اضافہ نہیں بلکہ قراءت کی سہولت تھا۔ سوم، اس مصحف کی قراءت میں وہ متواتر قراءتیں باقی رہیں جو عرضۂ اخیرہ سے ثابت تھیں، یوں رسم ایک ہونے کے باوجود متواتر قراءتوں کی گنجائش موجود رہی۔ چہارم، اس پورے عمل پر صحابہ کا اجماع رہا اور کسی بڑے صحابی نے اس کی مخالفت نہیں کی، بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اگر وہ اس منصب پر ہوتے تو وہی کرتے جو عثمان نے کیا۔

جدول :دونوں ادوار کا تقابل

پہلو	عہدِ نبویﷺ	عہدِ عثمانیؓ
بنیادی کام	وحی کی کتابت، ترتیب کی تعیین اور حفظ	معیاری مصحف کی تیاری و اشاعت
ذمہ دار	نبی کریم ﷺ کی نگرانی، کاتبینِ وحی	حضرت عثمانؓ، کمیٹی بہ سربراہی زید بن

		ثابتؓ
صورت	منتشر صحیفے اور حافظوں کے سینے	یکساں رسم کے مصاحفِ امہات
مقصد	وحی کی فوری حفاظت و ابلاغ	اختلافِ قراءت کا خاتمہ و یکسانیت

دونوں ادوار کی نوعیت کا تقابلی جائزہ

دونوں ادوار کا تقابل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی کے کام کی نوعیت تاسیس و تحریر کی تھی، یعنی وحی کا نزول، اس کی فوری کتابت، ترتیب کی تعیین اور حفظ کے ذریعے امت تک ابلاغ۔ اس دور میں قرآن مکمل تھا مگر تحریری صورت منتشر تھی اور اس کی حفاظت کا اصل انحصار تواتر یعنی حافظوں کی کثیر تعداد پر تھا۔ عہدِ عثمانی کے کام کی نوعیت توحید و معیار سازی کی تھی، یعنی ایک مصحف کو سرکاری معیار قرار دے کر اس کی مصدقہ نقلیں پورے عالمِ اسلام میں پھیلانا اور اختلافِ قراءت کی عملی صورتوں کو ختم کرنا۔ اس دور میں نہ کوئی آیت شامل کی گئی اور نہ خارج، صرف املا اور لہجے کی یکسانیت قائم کی گئی۔

یہ فرق سمجھ لینے سے مستشرقین کا یہ اعتراض خود بخود ختم ہو جاتا ہے کہ قرآن عثمانی دور میں مرتب ہوا۔ مرتب ہونا اور معیاری نسخہ جاری کرنا دو الگ عمل ہیں۔ پہلا عمل نبی کریم ﷺ کی زندگی میں مکمل ہو چکا تھا، دوسرا عمل خلافتِ عثمانی میں اسی مرتب متن کی حفاظت کے لیے کیا گیا۔ اسی طرح یہ اعتراض بھی بے بنیاد ہو جاتا ہے کہ ذاتی مصاحف کے ضائع کرنے سے کوئی متن ضائع ہوا، کیونکہ وہ صحیفے انفرادی نوٹ اور تفسیری حواشی پر مشتمل تھے اور ان کا عوامی متن متواتر متن سے الگ نہیں تھا، اور کمیٹی میں وہی صحابہ شامل تھے جن کے پاس اس مواد تک رسائی بھی موجود تھی۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ عہدِ نبوی میں جمعِ قرآن کی نوعیت حفظ و کتابت کے امتزاج پر مبنی تھی :آیات نزول کے ساتھ لکھی اور یاد کی جاتیں، ان کی ترتیب خود رسول اللہ ﷺ متعین فرماتے اور عرضۂ اخیرہ میں پورا قرآن آخری صورت میں پیش ہوا، البتہ تحریری مواد منتشر صحیفوں میں تھا۔ عہدِ عثمانی میں جمع کی نوعیت توحیدِ مصحف کی تھی :صدیقی

مصحف کو بنیاد بنا کر لہجۂ قریش میں معیاری نسخے تیار کیے گئے اور قاریوں کے ساتھ بڑے شہروں میں بھیجے گئے، جس پر صحابہ کا اجماع رہا۔ دونوں ادوار مل کر اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں کہ قرآن کا متن پہلے دن سے مسلسل نگرانی میں محفوظ رہا اور امت تک تواتر سے پہنچا۔

سوال نمبر 3: متنِ قرآنی سے متعلق استشراقی فکر کے مآخذ (20 نمبر)

سوال نمبر3 ۔ متنِ قرآنی سے متعلق استشراقی فکر کے مآخذ بیان کیجئے۔(20)

تعارف

مآخذ سے مراد وہ بنیادی سرچشمے ہیں جن سے مستشرقین نے متنِ قرآن کے بارے میں اپنے تصورات اخذ کیے۔ کوئی بھی فکر ہوا میں پیدا نہیں ہوتی؛ اس کے پیچھے کتابیں، روایات، فلسفے اور طریقۂ تحقیق ہوتے ہیں۔ متنِ قرآن کے بارے میں استشراقی فکر کا جائزہ لیتے وقت یہ دیکھنا ضروری ہے کہ انہوں نے معلومات کہاں سے لیں، کن کتابوں کو بنیاد بنایا، کن روایات کو منتخب کیا اور کس علمی طریقے کو اپنایا۔ اس تجزیے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان کے بہت سے نتائج مآخذ کے انتخاب ہی میں طے ہو گئے تھے۔

ذیل میں ان مآخذ کو چند بڑے گروہوں میں تقسیم کر کے بیان کیا جاتا ہے :قدیم یہودی و عیسائی جدلی ادب، قرونِ وسطیٰ کے لاطینی تراجم و کتب، اسلامی مآخذ کا انتخابی استعمال، مستشرقین کی باہمی تحریریں، قدیم مخطوطات و آثار، اور بائبلی تنقید کے اصول۔ یہ تمام سرچشمے مل کر وہ ذہنی سانچہ بناتے ہیں جس میں قرآنی متن کو پرکھا گیا۔

یہودی و عیسائی جدلی ادب

استشراقی فکر کا قدیم ترین ماخذ وہ جدلی و مناظرانہ ادب ہے جو اسلام کے ابتدائی صدیوں میں یہودی و عیسائی اہلِ قلم نے تیار کیا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں یوحنا دمشقی نے اسلام کو عیسائی بدعتوں کے ذیل میں رکھ کر اس پر تنقید کی اور قرآن کے بارے میں وہی سوالات اٹھائے جو بعد میں صدیوں تک دہرائے جاتے رہے۔ اسی فضا میں دوسرے عیسائی مصنفین نے رسالے لکھے جن میں قرآن کے ماخذ، اس کی جمع و ترتیب اور اس کے اسلوب پر اعتراضات کیے گئے۔ یہ ادب

علمی تحقیق سے زیادہ مذہبی دفاع و حملے کی نوعیت رکھتا تھا، لیکن بعد کے مستشرقین نے اسے ایک ماخذ کے طور پر استعمال کیا اور اس کے سوالات کو جدید علمی زبان میں دوبارہ پیش کیا۔

یہودی جدلی ادب سے بھی بعض تصورات منتقل ہوئے، خصوصاً یہ دعویٰ کہ قرآن کے قصص تورات و تلمود سے لیے گئے ہیں۔ ابراہم گائیگر نے1833ء میں اپنی کتاب میں یہی سوال اٹھایا کہ محمد ﷺ نے یہودیت سے کیا اخذ کیا، اور اس کتاب کو بعد کی پوری استشراقی روایت میں بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل رہی۔ یوں گائیگر کی کتاب دراصل اسی قدیم جدلی روایت کی جدید علمی صورت تھی۔ اس پس منظر سے معلوم ہوتا ہے کہ استشراقی فکر کے اولین مآخذ غیر جانبدار علمی کتب نہیں بلکہ مناظرانہ تحریریں تھیں، اور ان کا رنگ بعد کی تحقیق میں کسی نہ کسی درجے میں باقی رہا۔

قرونِ وسطیٰ کے تراجم اور لاطینی کتب

دوسرا ماخذ قرونِ وسطیٰ کا لاطینی ادب ہے۔ بارہویں صدی میں پیٹر محترم کی سرپرستی میں قرآن کا لاطینی ترجمہ تیار ہوا، جس کا مقصد خود منتظمین کے بیان کے مطابق اسلام کا رد تھا۔ اسی مجموعے کے ساتھ اسلام کے خلاف کئی رسالے بھی شامل تھے۔ ان تراجم و رسالوں نے یورپ میں قرآن کی وہ تصویر قائم کی جو صدیوں تک تعلیمی و مذہبی کتب میں چلتی رہی۔ سولہویں صدی میں یہی ترجمہ چھپ کر پھیلا اور مناظرین نے اسی کو بنیاد بنایا۔

اسی دور سے ایک اور ماخذ یہ پیدا ہوا کہ مغربی مصنفین اصل عربی متن کے بجائے ایک دوسرے کی کتب سے نقل کرنے لگے۔ مسافروں کے سفرنامے، صلیبی جنگوں کی تاریخیں اور راہبوں کی تحریریں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غلط معلومات اور افسانوی قصے بھی معتبر مآخذ کی حیثیت اختیار کر گئے اور انیسویں صدی کے محقق تک پہنچے۔ جدید مستشرقین نے اگرچہ اصل متن کی طرف رجوع کیا، لیکن ان کے ذہن میں بیٹھے ہوئے سوالات اور مفروضے بڑی حد تک اسی قرونِ وسطیٰ کی روایت سے آئے تھے۔

اسلامی مآخذ کا انتخابی استعمال

تیسرا اور سب سے اہم ماخذ خود اسلامی مآخذ ہیں، لیکن ان کا استعمال انتخابی انداز میں ہوا۔ مستشرقین نے سیرت میں ابن اسحاق و واقدی کی روایات، تاریخ میں طبری کی منقول خبریں، اور جمعِ قرآن کے باب میں کتاب المصاحف اور

فضائل و قراءات کی کتب کو بنیاد بنایا۔ ان کتب میں ہر قسم کی روایات موجود ہیں، کیونکہ مؤلفین کا مقصد مواد جمع کرنا تھا، نہ کہ ہر خبر کو صحیح قرار دینا۔ مسلم محدثین نے انہی روایات کو سند و متن کے اصولوں پر پرکھ کر صحیح و ضعیف کو الگ کر دیا تھا۔ مستشرقین نے عموماً یہ راستہ اختیار کیا کہ جو روایت ان کے مفروضے کے موافق ہو اسے قبول کر لیا اور جو مضبوط و متواتر روایت اس کے خلاف ہو اسے نظر انداز کر دیا یا اسے بعد کی اختراع قرار دے دیا۔

اس انتخابی استعمال کی نمایاں مثالیں یہ ہیں :جمعِ قرآن کی بحث میں صحابہ کے ذاتی مصاحف سے متعلق شاذ و منفرد خبریں تو بڑھا چڑھا کر پیش کی گئیں، مگر تواتر، حفظ اور مرحلۂ اخیرہ کی مضبوط روایات کو اہمیت نہ دی گئی۔ نسخ کی بحث میں وہ اقوال منتخب کیے گئے جن سے منسوخ آیات کی تعداد بہت بڑی معلوم ہو، اور قراءات کی بحث میں شاذ قراءتوں کو اصل متن کا اختلاف بنا کر پیش کیا گیا۔ اسی طرح اسرائیلیات اور قصص کی ضعیف روایات کو قرآن کے قصص کا ماخذ قرار دیا گیا۔ یوں ان کا نتیجہ ماخذ کے اندر پہلے سے موجود نہیں تھا، بلکہ انتخاب کے عمل میں پیدا ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم محققین استشراقی فکر پر تنقید میں سب سے پہلے اسی انتخابی ماخذ گیری کی نشاندہی کرتے ہیں۔

مستشرقین کی باہمی تحریریں اور بائبلی تنقید کا طریقہ

چوتھا ماخذ خود مستشرقین کی پیش رو تحریریں ہیں۔ استشراق ایک مسلسل روایت ہے جس میں ہر نسل پچھلی نسل کے نتائج کو مسلمہ بنیاد بنا کر آگے بڑھتی ہے۔ وائل نے سیرت کی زمانی تقسیم پیش کی، نولڈکے نے اسے تاریخِ قرآن میں استعمال کیا، بیل نے اس سے ترتیبِ نزول کا اپنا نظام بنایا، اور وانسبرا نے انہی بنیادوں پر مزید انتہائی نتائج نکالے۔ اسی طرح گولڈزیہر کے حدیث کے بارے میں شکوک شاخت کے ہاں اصول بن گئے اور شاخت کے اصول بعد والوں کے ہاں مسلمات۔ اس باہمی اقتباس سے ایک ایسی صورت پیدا ہوئی کہ ایک مفروضہ نقل در نقل معتبر حقیقت کا درجہ پا گیا، حالانکہ اس کی اصل بنیاد کمزور تھی۔

پانچواں ماخذ بائبلی تنقید یعنی بائیبل پر لاگو کیے گئے جدید تاریخی تنقیدی اصول ہیں۔ انیسویں صدی میں مغربی علماء نے بائیبل کے متن پر ماخذ تنقید، صورت تنقید اور تحریری ارتقا کے اصول لاگو کیے، جن کی رو سے ایک کتاب مختلف ادوار میں مختلف مصنفین و مرتبین کے ہاتھوں صورت پاتی ہے۔ مستشرقین نے یہی اصول و سانچے قرآن پر منتقل کر دیے

اور قرآن کی جمع و ترتیب، اس کے قصص اور اس کے احکام کو انہی خطوط پر سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ قدیم مخطوطات، کتبے اور آثارِ قدیمہ کو بھی ماخذ بنایا گیا، مثلاً یمن سے ملنے والے قدیم مصاحف کے اوراق پر ہونے والی بحثیں۔ یہ ماخذ فی نفسہ قیمتی ہے، لیکن اس سے نتائج نکالنے میں بھی اکثر جلد بازی اور مبالغے سے کام لیا گیا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ متنِ قرآن سے متعلق استشراقی فکر کے مآخذ پانچ بڑے سلسلوں سے آتے ہیں :قدیم یہودی و عیسائی جدلی ادب، قرونِ وسطیٰ کے لاطینی تراجم و مناظرانہ کتب، اسلامی مآخذ کا انتخابی و جزوی استعمال، پیش رو مستشرقین کی تحریروں کی باہمی روایت، اور بائبلی تنقید کے اصول و قدیم مخطوطات کی جزوی شہادت۔ ان مآخذ میں سے ہر ایک اپنی اصل حیثیت رکھتا ہے، لیکن ان سے نتائج نکالنے میں انتخاب، پیشگی مفروضے اور دوسری کتاب پر قیاس جیسے عوامل شامل رہے ہیں۔ اس لیے قرآنی متن کے بارے میں کسی استشراقی دعوے کو قبول یا رد کرنے سے پہلے اس کے ماخذ، اس کی سند اور اس کے استعمال کے انداز کو پرکھنا علمی دیانت کا تقاضا ہے۔

سوال نمبر :4 قرآنی متن کے حوالے سے مستشرقین کا زاویۂ نگاہ 20) نمبر(

سوال نمبر4 ۔ قرآنی متن کے حوالے سے مستشرقین کا زاویہ نگاہ کیا ہے؟ نوٹ تحریر کیجئے۔(20)

تعارف

زاویۂ نگاہ سے مراد وہ بنیادی رویہ اور فکری موقف ہے جس سے کوئی محقق اپنے موضوع کو دیکھتا ہے۔ قرآنی متن کے بارے میں مستشرقین کا زاویۂ نگاہ مسلمان علماء کے زاویے سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ مسلمان قرآن کو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی، محفوظ اور معجز کتاب مانتا ہے اور اسی ایمانی بنیاد پر اس کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس بیشتر کلاسیکی مستشرقین نے قرآن کو ایک تاریخی دستاویز کے طور پر لیا، یعنی ایک ایسی کتاب جسے ساتویں صدی کے عرب ماحول کی پیداوار سمجھ کر اس کے انسانی مآخذ، اس کی تدوین کے مراحل اور اس کے اسلوب کی خارجی توجیہ تلاش کی جائے۔ یہی بنیادی فرق ان کے تمام جزوی مباحث کی جڑ ہے۔

اس نوٹ میں اس زاویۂ نگاہ کے بڑے عناصر بیان کیے جائیں گے :وحی کے تصور سے انکار یا اس کی طبعی توجیہ، قرآن کے خارجی مآخذ کی تلاش، ترتیب و تدوین پر تاریخی تنقید، قراءات و اسلوب پر اعتراضات، اور اس کے ساتھ وہ نسبتاً معتدل آوازیں بھی جنہوں نے قرآن کے ادبی مقام اور اس کی تاریخی حفاظت کے بعض پہلوؤں کا اعتراف کیا۔ آخر میں اس زاویے کا مختصر تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

وحی کے تصور کے بارے میں رویہ

مستشرقین کے زاویۂ نگاہ کا پہلا اور مرکزی عنصر وحی کے الہامی تصور کو قبول نہ کرنا ہے۔ ان میں سے بیشتر نے یا تو صریحاً کہا کہ قرآن محمد ﷺ کی اپنی تصنیف ہے، یا بالواسطہ یہ موقف اپنایا کہ یہ آپ کے مذہبی تجربات، مراقبے اور ماحول سے حاصل شدہ تاثرات کا مجموعہ ہے۔ ولیم میور اور ڈی۔ ایس۔ مارگولیتھ جیسے مصنفین نے اسی خط پر لکھا اور نبی کریم ﷺ کی سیرت کے واقعات کو اس مفروضے کے تابع کر کے بیان کیا۔ بعض نے نفسیاتی توجیہات پیش کیں اور بعض نے یہ کہا کہ آپ ﷺ نے مخلصانہ طور پر اپنے باطنی تجربے کو وحی سمجھا۔

اس رویے کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآنی متن کا ہر دعویٰ انہیں ایک انسانی دعوے کے طور پر نظر آیا جس کی تصدیق یا تردید تاریخی شواہد سے ہونی چاہیے۔ وحی کو ماننے کی صورت میں جو سوالات پیدا ہی نہیں ہوتے، مثلاً ترتیب توقیفی ہے یا اجتہادی، نسخ حکمت ہے یا تضاد، وہ سب اس زاویے میں بڑے مسائل بن گئے۔ مسلم علماء کی تنقید کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ زاویہ تحقیق سے پہلے کا فیصلہ ہے، تحقیق کا نتیجہ نہیں؛ کیونکہ جب محقق آغاز ہی میں وحی کا انکار طے کر لے تو پھر اس کے سامنے انسانی ماخذ تلاش کرنے کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔

قرآن کے خارجی مآخذ کی تلاش

دوسرا عنصر قرآن کے مضامین کے خارجی مآخذ کی تلاش ہے۔ اس زاویے سے قرآن کے قصص، عقائد اور احکام کو یہودیت، عیسائیت، مجوسیت اور قدیم عرب روایات سے ماخوذ بتانے کی کوشش کی گئی۔ گائیگر نے یہودی مآخذ پر زور دیا، بعض نے عیسائی و سریانی ادب کو بنیاد بنایا، جیفری نے قرآنی الفاظ کی غیر عربی اصل تلاش کی، اور رچرڈ بیل نے قرآن اور

عیسائیت کے تعلق پر کتاب لکھی۔ ان مطالعات میں مماثلت کو ماخذ ہونے کی دلیل بنا لیا گیا، یعنی جہاں بائیبل یا تلمود کے کسی قصے سے مشابہت ملی وہیں یہ کہہ دیا گیا کہ قرآن نے وہیں سے لیا ہے۔

مسلم نکتہ نظر سے اس استدلال میں کئی کمزوریاں ہیں۔ اول، مماثلت بذاتِ خود اخذ کی دلیل نہیں ہوتی، کیونکہ قرآن خود کہتا ہے کہ وہ پچھلی وحی کی تصدیق کرتا ہے، اس لیے اصل واقعات میں یکسانیت متوقع ہے۔ دوم، قرآن کے قصص اور بائبلی روایات میں اہم مقامات پر اختلاف بھی ہے، مثلاً انبیاء کی عصمت اور اخلاقی تصویر، اور یہ اختلاف اخذ و نقل کے دعوے کو کمزور کرتا ہے۔ سوم، ساتویں صدی کے حجاز میں ان مآخذ تک اس تفصیلی رسائی کا کوئی تاریخی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکا جس کا دعویٰ کیا گیا۔ اس کے باوجود یہ تلاش استشراقی زاویے کی پہچان بن گئی اور آج تک اس مکتب کی کتابوں میں یہی سوالات نئی زبان میں دہرائے جاتے ہیں۔

جدول: نمایاں مستشرقین اور ان کا خاص زاویہ

مستشرق	نمایاں کام / موضوع	قرآنی متن پر خاص زاویہ
نولڈکے	تاریخِ قرآن	سورتوں کی زمانی ترتیب کا نیا نظام
گولڈزیہر	حدیث و تفسیر پر تنقید	روایت کی تاریخی تشکیل کا نظریہ
جیفری	غیر ملکی الفاظ؛ مصاحف کے متون	الفاظ کے خارجی مآخذ اور شخصی مصاحف پر زور
وانسبرا	قرآنی مطالعات کا تجزیہ	تدوینِ قرآن کے متاخر ہونے کا نظریہ
واٹ	سیرت پر معتدل کتب	نسبتاً ہمدردانہ، کئی پرانے الزامات کا رد

ترتیب، تدوین اور قراءات کے بارے میں رویہ

تیسرا عنصر قرآنی متن کی ترتیب و تدوین کو مشکوک سمجھنا ہے۔ نولڈکے نے سورتوں کی زمانی ترتیب کا اپنا نظام بنایا اور مکی و مدنی تقسیم کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ جون وانسبرا نے اس سے آگے بڑھ کر یہ نظریہ پیش کیا کہ قرآن کی تدوین بہت بعد میں اور طویل عرصے میں ہوئی۔ بعض مستشرقین نے جمعِ عثمانی کو متن میں سیاسی مداخلت سے تعبیر کیا اور

صحابہ کے ذاتی مصاحف کی روایات کو بنیاد بنا کر یہ تاثر دیا کہ اصل میں متعدد متون موجود تھے۔ قراءات کے بارے میں ان کا زاویہ یہ رہا کہ انہیں متن کے اختلافات قرار دیا جائے، حالانکہ مسلم علم میں قراءات کی باقاعدہ تعریف، شرائط اور تواتر کا نظام موجود ہے اور شاذ قراءت کو قرآن شمار ہی نہیں کیا جاتا۔

اسی طرح سورتوں کی موجودہ ترتیب کو غیر منطقی قرار دے کر اس پر سوال اٹھایا گیا کہ سورتوں کو زمانی ترتیب پر کیوں نہ رکھا گیا۔ اس اعتراض کے پیچھے بھی وہی مفروضہ ہے کہ یہ ترتیب انسانی مرتبین کی ہے، جبکہ مسلم موقف یہ ہے کہ آیات کی ترتیب توقیفی ہے اور سورتوں کی ترتیب بھی صحابہ کے اجماع اور عرضۂ اخیرہ کی بنیاد پر قائم ہے، اور زمانی ترتیب کا نہ ہونا کوئی نقص نہیں کیونکہ قرآن تاریخ کی کتاب نہیں بلکہ ہدایت کی کتاب ہے جس کا ہر حصہ ہر دور کے قاری کے لیے ہے۔ یہاں بھی دو زاویوں کا فرق بالکل واضح ہو جاتا ہے :ایک طرف متن کو ایمان و تواتر کی بنیاد پر مکمل و محفوظ ماننا ہے اور دوسری طرف اسے مسلسل شک کی نظر سے دیکھنا۔

اسلوب، زبان اور مضامین پر اعتراضات؛ معتدل آوازیں

چوتھا عنصر اسلوب و مضامین پر اعتراضات ہیں :قرآن میں تکرار کو کمزوری کہا گیا، قصص کے بکھرے ہوئے بیان کو غیر مربوط قرار دیا گیا، اور بعض احکام و واقعات کو اس دور کے عرب معاشرے کی عکاسی کہہ کر اس کی ابدیت پر سوال اٹھایا گیا۔ نسخ کو تضاد اور مدونین کی مداخلت کی دلیل بنایا گیا اور سائنسی و تاریخی اشارات پر جدید معیارات سے سوالات کیے گئے۔ ان اعتراضات کا مشترکہ انداز یہ ہے کہ قرآن کو اس کے اپنے بیان کردہ مقصد و اسلوب کے بجائے مغربی ادبی و تاریخی معیارات پر پرکھا جائے۔

تاہم یہ کہنا بھی انصاف نہیں کہ تمام مستشرقین کا زاویہ یکسر منفی رہا۔ بعض محققین نے قرآن کے ادبی حسن اور اس کے عرب ادب پر اثرات کا اعتراف کیا؛ آربری جیسے مترجمین نے اس کے اسلوب کی عظمت کو سراہا؛ مونٹگمری واٹ نے نبی کریم ﷺ کی صداقت و اخلاص کو تسلیم کیا اور بہت سے پرانے الزامات کو رد کیا؛ اور جدید مخطوطات کی تحقیق کے دور میں کئی مغربی محققین نے قرآنی متن کی قدیم ترین صورت میں غیر معمولی استحکام کو بھی تسلیم کیا ہے۔ یہ معتدل آوازیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ زاویۂ نگاہ محقق کے اپنے مفروضات سے بنتا ہے اور جب مفروضے بدلے تو نتائج بھی

نرم ہوئے۔ پھر بھی مجموعی طور پر کلاسیکی استشراق کا غالب زاویہ شک، خارجی ماخذ کی تلاش اور تاریخی تنقید ہی رہا ہے۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ قرآنی متن کے حوالے سے مستشرقین کا زاویۂ نگاہ ایک تاریخی تنقیدی زاویہ ہے جس کی بنیاد وحی کے الہامی تصور کو معلق یا رد کرنے پر ہے۔ اسی بنیاد سے قرآن کے انسانی مآخذ کی تلاش، اس کی تدوین و ترتیب پر شک، قراءات کو اختلافِ متن سمجھنا اور اسلوب و مضامین پر اعتراضات جنم لیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مسلم زاویہ وحی، تواتر اور اجماعِ امت پر قائم ہے اور وہ انہی اعتراضات کے مفصل جوابات پیش کرتا ہے۔ طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی بھی استشراقی کتاب کو پڑھتے وقت پہلے اس کے زاویۂ نگاہ کو پہچانے، کیونکہ دلیل کی قوت کا فیصلہ اسی وقت درست ہوتا ہے جب یہ معلوم ہو کہ محقق کن مفروضات سے آغاز کر رہا ہے۔

سوال نمبر 5: تورات و انجیل میں وقوعِ تحریف کے شواہد (20 نمبر)

سوال نمبر5 ۔ تورات و انجیل میں وقوعِ تحریف کے شواہد کے بارے میں نوٹ تحریر کیجئے۔(20)

تعارف

تحریف سے مراد کسی کتاب کے متن یا معنی کو بدل دینا ہے۔ اسلام کا موقف قرآن مجید کی تصریحات کی بنیاد پر یہ ہے کہ تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی کے طور پر نازل ہوئیں، لیکن ان کے پیروکاروں کے ہاتھوں ان کے متون میں تبدیلیاں واقع ہوئیں، جبکہ قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اس سوال میں ان شواہد کا جائزہ مقصود ہے جن سے تورات و انجیل میں تحریف کا وقوع ثابت ہوتا ہے۔ یہ شواہد چار قسم کے ہیں :قرآنی تصریحات، ان کتابوں کے داخلی اختلافات و تضادات، ان کے نسخوں کی باہمی تفاوت، اور خود یہودی و عیسائی علماء و جدید متن تنقید کے اعترافات۔

یہ بحث علمی انداز میں کرنی چاہیے۔ مقصود کسی کی دل آزاری نہیں، بلکہ یہ دکھانا ہے کہ جن کتابوں کے متن کی تاریخ خود ان کے ماہرین کے نزدیک غیر مستحکم ہے، انہی کے معیار کو قرآن پر لاگو کر کے اس کی حفاظت پر سوال اٹھانا دوہرا معیار ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ پچھلی کتابوں کا مصدق بھی ہے اور ان پر نگران بھی، اس لیے تحریف کی بحث قرآنی مطالعے کا فطری حصہ ہے۔

تحریف کی اقسام اور قرآنی شواہد

علماء نے تحریف کی دو بڑی قسمیں بیان کی ہیں :تحریفِ لفظی، یعنی متن کے الفاظ میں کمی بیشی یا تبدیلی، اور تحریفِ معنوی، یعنی الفاظ تو باقی رکھنا مگر ان کی تاویل و تشریح بدل کر اصل مقصد سے ہٹا دینا۔ بعض مقامات پر تحریف کا ایک تیسرا انداز بھی ہوا کہ کسی حصے کو چھپا لیا گیا یا بھلا دیا گیا۔ قرآن مجید نے ان تینوں صورتوں کی طرف اشارہ کیا ہے :یہودیوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ کلمات کو ان کے مقامات سے ہٹا دیتے ہیں، لکھے ہوئے کو اللہ کی طرف منسوب کرنے کا ذکر سورۃ البقرہ میں آیا، اور بعض اہلِ کتاب کے بارے میں کہا گیا کہ انہوں نے کتاب کے ایک حصے کو فراموش کر دیا۔

قرآنی شواہد کی نوعیت اصولی ہے، یعنی قرآن یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ تحریف واقع ہوئی ہے۔ اس کے بعد اس کی جزوی تصدیق تاریخی و داخلی شواہد سے ہوتی ہے، جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ پوری تورات و انجیل کا ایک ایک لفظ بدل گیا؛ مسلمان علماء کی اکثریت کا موقف یہ رہا ہے کہ ان کتابوں میں اصل وحی کا کچھ حصہ بھی باقی ہے اور تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں، اسی لیے قرآن کو ان پر محاکم یعنی پرکھنے والا قرار دیا گیا ہے :جو بات قرآن سے موافق ہے وہ اصل کی باقیات ہو سکتی ہے اور جو اس سے متصادم ہے وہ تبدیلی کی زد میں آیا ہوا حصہ ہے۔

تورات میں تحریف کے شواہد

تورات کے بارے میں پہلا شاہد اس کے نسخوں کا باہمی اختلاف ہے۔ عبرانی متن، سامری تورات اور یونانی ترجمے سپتواجنٹ کے درمیان ہزاروں مقامات پر تفاوت پائی جاتی ہے، عمروں اور زمانی حسابات میں بڑے فرق ہیں اور بعض

واقعات کی تفصیلات آپس میں نہیں ملتیں۔ اگر متن ہر دور میں یکسان و محفوظ رہا ہوتا تو یہ تفاوت ممکن نہ ہوتی۔ دوسرا شاہد داخلی تضادات ہیں :تخلیق کے دو بیانات میں ترتیب کا فرق، طوفانِ نوح کی مدت و جانوروں کی تعداد میں اختلاف، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات و تدفین کا بیان خود تورات کے اندر موجود ہونا، جو اس بات کی دلیل سمجھا جاتا ہے کہ یہ حصے بعد میں شامل ہوئے۔

تیسرا شاہد خود یہودی و عیسائی متن تنقید کے نتائج ہیں۔ جدید مغربی تحقیق میں یہ نظریہ عام ہوا کہ تورات کی پانچ کتابیں ایک دور میں ایک مصنف کی تصنیف نہیں بلکہ مختلف ادوار کے مآخذ کا مجموعہ ہیں، جسے فرضیۂ مآخذ کہا جاتا ہے۔ اس نظریے کو ماننے کا مطلب یہی ہے کہ موجودہ متن تاریخی تدوین کی پیداوار ہے۔ چوتھا تاریخی شاہد یہ ہے کہ تورات کے قدیم ترین مکمل نسخے نزول کے زمانے سے بہت بعد کے ہیں اور درمیان کے طویل وقفے کا کوئی متواتر سلسلۂ حفظ موجود نہیں جیسا قرآن کے معاملے میں ہے۔ بحیرہ مردار کے طومار وں نے بھی قدیم نسخوں کے درمیان بعض اختلافات کو ظاہر کیا ہے۔ ان تمام شواہد کا حاصل یہ ہے کہ تورات کا موجودہ متن تبدیلیوں سے خالی نہیں رہا۔

انجیل میں تحریف کے شواہد

انجیل کے معاملے میں سب سے بنیادی نکتہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی انجیل، جو ایک کتاب تھی، موجودہ چار اناجیل سے مختلف چیز ہے۔ موجودہ اناجیل ان کے ناموں سے منسوب مصنفین کی لکھی ہوئی سوانح و اقوال کی کتابیں ہیں جو علیہ السلام کے رفع کے کئی دہائیوں بعد یونانی زبان میں لکھی گئیں، جبکہ آپ کی زبان آرامی تھی۔ خود عیسائی تحقیق میں ان کے مصنفین کے بارے میں بحث موجود ہے اور کئی جدید محققین انہیں براہِ راست شاگردوں کی تصنیف نہیں مانتے۔

داخلی شواہد میں چاروں اناجیل کے باہمی اختلافات نمایاں ہیں :نسب ناموں میں فرق، بعض واقعات کی تفصیلات و ترتیب میں تفاوت، آخری ایام کے بیانات میں اختلاف، اور یوحنا کی انجیل کا اسلوب و مضمون باقی تین سے واضح طور پر مختلف ہونا۔ نسخوں کی سطح پر بعض مشہور اضافے اب خود عیسائی محققین کے نزدیک بعد کے معلوم ہوتے ہیں، مثلاً مرقس کی انجیل کی آخری آیات اور یوحنا میں ایک مشہور واقعے کی عبارت قدیم ترین نسخوں میں موجود نہیں، اور رسالۂ یوحنا کی ایک مشہور آیت بھی قدیم یونانی نسخوں سے غیر حاضر رہی ہے۔ عبرانیوں کے خط اور دوسری تحریروں

میں صدیوں تک کینن یعنی مستند کتابوں کی فہرست پر اختلاف رہا اور اپاکریفا کتابوں کی حیثیت پر کیتھولک و پروٹسٹنٹ آج بھی مختلف ہیں۔ خود مغرب کے نامور متن ناقدین نے نئے عہد نامے کے نسخوں میں شمار سے زیادہ اختلافات کی موجودگی لکھی ہے؛ ان میں سے بیشتر معمولی ہیں مگر ان کا وجود ہی متن کی مکمل استحکام کے دعوے کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ تمام شواہد اس قرآنی موقف کی تاریخی تائید کرتے ہیں کہ ان کتابوں کا متن انسانی مداخلت سے محفوظ نہیں رہا۔

جدول : تحریف کے نمایاں شواہد

کتاب	شاہد کی نوعیت	مثال
تورات	نسخوں کا اختلاف	عبرانی، سامری و یونانی نسخوں میں زمانی حسابات کا فرق
تورات	داخلی شواہد	تخلیق کے دو بیانات؛ حضرت موسیٰؑ کی وفات کا بیان کتاب کے اندر
انجیل	نسخوں سے غیر حاضر اضافے	مرقس کے آخری حصے کی آیات قدیم نسخوں میں غیر موجود
انجیل	باہمی اختلاف	چار اناجیل میں نسب ناموں و واقعات کی تفصیل کا فرق

اس بحث کا حاصل اور قرآن سے تقابل

اس بحث کا حاصل یہ نہیں کہ اہلِ کتاب کی کتابوں میں کوئی حق باقی نہیں، بلکہ یہ ہے کہ ان کے متون کی تاریخ تحریف و تدوین کی تاریخ ہے اور وہ اپنے موجودہ متن کی حرف بحرف حفاظت کا وہ دعویٰ نہیں کر سکتے جو قرآن اپنے بارے میں کرتا ہے اور جس کی تصدیق تواتر، حفظ اور قدیم ترین نسخوں کی باہمی مطابقت سے ہوتی ہے۔ اس تقابل سے ایک اور علمی نکتہ نکلتا ہے :مستشرقین نے متن تنقید کے جو اصول بائیبل کی اسی غیر مستحکم متنی تاریخ کے مطالعے سے اخذ کیے

تھے، انہیں قرآن پر، جس کی متنی تاریخ سرے سے مختلف ہے، من و عن لاگو کر دیا۔ یہی طریقہ کار کی بنیادی غلطی ہے جس کی طرف اس کورس میں بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔

ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ مسلمان کا رویہ ان کتابوں کے بارے میں توہین کا نہیں ہے۔ قرآن نے تورات کو ہدایت و نور اور انجیل کو بھی ہدایت قرار دیا ہے، اصل وحی کے اعتبار سے۔ بحث صرف ان کے موجودہ متون کی تاریخی حیثیت پر ہے اور وہ بھی علمی شواہد کی روشنی میں۔ اسی لیے اس بحث کو جذبات کے بجائے نسخوں، تضادات اور ماہرین کے اعترافات کی ٹھوس بنیاد پر رکھا گیا ہے۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ تورات و انجیل میں تحریف کے وقوع کے شواہد مضبوط اور متعدد ہیں :قرآن کی صریح تصریحات، تورات کے نسخوں کی باہمی تفاوت و داخلی تضادات اور اس کی تدوین کے بارے میں خود مغربی تحقیق کے نتائج، انجیل کے معاملے میں اصل وحی اور موجودہ چار اناجیل کا فرق، ان کے باہمی اختلافات، قدیم نسخوں کے غیر حاضر بعد کے اضافے اور مستند کتابوں کی فہرست پر تاریخی اختلاف۔ ان شواہد کے مقابلے میں قرآن کا متن اپنی حفاظت کے بے مثال نظام، تواتر اور نسخوں کی مطابقت کے ساتھ کھڑا ہے۔ یہی تقابل اس سوال کا اصل سبق ہے اور یہی قرآن کے اس دعوے کی عملی تصدیق ہے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے۔